ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol. 5 No.1 2021

مفتوح ہوائیں... فکری تنوع کی ایک مثال

بلقیس اقبال ،اسسٹنٹ پروفیسر،شعبہ اُردو، گورنمنٹ صادق کالج و یمن یونی ورسٹی بہاول پور

ڈاکٹر عاصمہ رانی ،اسسٹنٹ پروفیسر،شعبہ اُردو، گورنمنٹ صادق کالج ویمن یونی ورسٹی ،بہاول پور

ڈاکٹر اقصی نسیم سندھو،اسسٹنٹ پروفیسر،شعبہ اردو گورنمنٹ صادق کالج ویمن یونی ورسٹی،بہاول پور

Abstract:

In this research paper, we examine the aesthetical point view of Ahmad Dawood's first collection of short stories "Maftooh Hawayain". Basically, Ahmad Dawood was an innocent and devoutly righteous person. He had revulsion towards visual impairment because always focused on the vision and deep insights to write a short story. He is one of those short stores writers' who has revealed out the acrimonious realities of life with modern embellishments .In his short stories, numbers of issues regarding gender and virulent social tradition are highlighted, but his leisure interest was to protest against barbarousness. His strong point of view is to utilize the genuine and mental faculties to interpret the social awareness and ideology. So, it will not be unfair to consider him a part of intuitive reference.

Keywords: Ahmad Dawood, Maftooh Hawayain, Aesthetics, Fiction, Modernism.

ملک میں فنی و لسانی بحثوں کا آغاز ۱۹۶۰ءکے لگ بھگ ہوتا ہے۔لسانی بحثوں نے اُردوافسانے پر بھی اپنے اثرات مرتب کیے اور انھیں اثرات کی بدولت کہانی میں خارجیت اور حقیقت پرستی کے خلاف ردِ عمل کا آغاز ہوا۔ قلم کاروں نے حقیقت نگاری کو خیر باد کہا اور اس کے بر عکس استعارے اور علامت کو مضبوط ہتھیار کے طور پر استعمال کیا۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کی ہر عمل کے مخالف اس کے برابر کا ردِ عمل ہوا کرتا ہے۔ادیبوں اور دانش وروں کے ساتھ یہ سب سے بڑا المیہ ہے کہ وہ کبھی بھی بر سر اقتدار طبقے سے مفاہمت نہیں کر سکتے۔اس کی ایک وجہ تو ان کی اپنے فن کے ساتھ کمٹمنٹ ہے۔دوسرے وہ جس مثالی معاشرے کے خواب دیکھتے ہیں اور جیسی تبدیلی کی خواہش رکھتے ہیں وہ اس عالم فانی میں پورے نہیں ہو سکتے۔اسی باعث حکمران طبقے اور ادیبوں کے درمیان تصادم ہر دور میں جاری رہتا ہے۔مگر اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ زندگی ، ادیب اور سیاست کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔سیاست کے معاشرے پر اور معاشرے کے ادیب پر بہر حال اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ حقیقت نگاری کے خاتمے کے ساتھ ہی علامتی ، تجریدی اور تمثیلی افسانے کا آغاز ہوتا ہے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے یہ طرزِ نگارش عام قبولیت کی سند اختیار کر لیتا ہے۔ اس انداز نے افسانے کو معنویت کی نئ شاہراہوں سے روشناس کرایا۔بڑے افسانہ نگاروں نے اس طرز کو ایک نئ اور بہتر تبدیلی اور وقت کی ضرورت سمجھ کر قبول کیا۔ مگر بہت سے لکھنے والے جدت پسندوں نے اسے فیشن اور غیر ملکی چیز سمجھ کر اپنی کہانیوں میں جگہ دی۔ محمد منشایاد کے نزدیک:

اُردو افسانے میں روایت سے بغاوت اور علامتی ، تجریدی اور استعاراتی طرزِ اظہار دراصل اُردو شاعری خصوصاً نئ نظم سے متاثر ہو کر اپنایا گیا۔ چناچہ جب یہ ” نیا طرزِ لوگوں کو چونکانے اور مرعوب کرنے لگا تو روایت سے پوری طرح باخبر نہ ہونے والے ناپختہ ذہن کہانی کاروں نے اسے فیشن کی طرح اپنا لیا اور محض انشا پردازی کرنے لگے۔۔۔۔چناچہ افسانے کی فنی اور تکنیکی پہلوؤں سے نا آشنا کچے ذہن سہولت پسند افسانہ نگاروں نے محض جملے بازی اور فقرہ سازی کو سب کچھ سمجھ لیا۔۔۔ (افسانےکے نام سے لکھی جانے والی یہ تحریریں تاثر سے خالی تھیں۔(۱

اس دور میں جب افسانہ باطن کی دنیا سے نکل کر خارج میں آیا تو موجودہ حالات اور وقت کا ترجمان بن گیا۔انھی حالات نے افسانہ نگاروں کے انداز تحریر کو نیا رخ دیا اور حلقہ ارباب ذوق کے جلسوں نے انھیں مزید نکھارا۔اردو افسانے کو اسی گھٹن زدہ ماحول میں موضوعاتی تنوع اور فنی اور لسانی سطح پر نئ تکنیک سے واسطہ پڑا جن افسانہ نگاروں نے جبر و تشدد کے گھٹے ہوئے ماحول کی بھر پور عکاسی کی ہے ان میں رشید امجد، عرش صدیقی، ڈاکٹر مرزاحامد بیگ، احمد جاوید، مستنصر حسین تارڑ، علی حیدر ملک، احمد قاضی ، انور سجاد،خالدہ حسین، مسعود اشعر، آغا سہیل ، مظہر الاسلام، یوسف چوہدری، زاہدہ حنا، اعجاز راہی، طارق محمود، امراؤ طارق، شہزاد منظر، سمیع آہوجہ، اختر جمال اور احمد داؤد کے نام خاص طورپر لیے جاسکتے ہیں جنھوں نے نئے افسانے کو روشن منزل کی نوید دی۔ایسا نہیں تھا کہ پرانی روایتی کہانی الف لیلہ کے جن کی طرح

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol. 5 No.1 2021

اچانک کہیں غائب ہو گئی تھی اور اس کی جگہ علامتی کہانی نے لے لی تھی بلکہ روایتی کہانی بھی جدید افسانے کے ساتھ محو سفر رہی البتہ جدید افسانے میں اس دور کے تمام تقاضوں کو مد نظر رکھتے ہوئے افسانے کی دنیا کو بہت سے نئے موضوعات ، نئی تکنیک اور بہت سی نئی جہتوں سے روشناس کرایا۔

احمد داؤد نے اس وقت لکھنے کا آغاز کیا جب چھٹی دہائی اپنی آخری سانسیں لے رہی تھی۔اس نے لمحہ موجود کے سیاسی اور سماجی سفاک رویے کو جس طرح
اور جس شکل میں دیکھا اور محسوس کیا بالکل اسی طرح بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ ہی بے دردی سے اظہار کا تحریری طمانچہ اس نے معاشرے اور ارباب اختیار کے گھناؤ :نے چہرے پر نقش کر دیا۔محمد منشا یاد کے نزدیک

وہ ستر کی دہائی میں ابھرنے والاایک ایسا ذہین افسانہ نگار تھا جس نے افسانوی ادب میں بہت جلد اپنی انفرادیت پیدا کرلی اور اپنی روشن خیالی، صداقت نگاری اور ترقی " (پسندانہ خیالات کی وجہ سے اپنی شناخت قائم کر لی۔")۲

شہزاد منظر نے بھی محمد منشا یاد کی بات کی تائید کی ہے کہ احمد دواؤد ستر کے عشرے میں ابھرنے والے جدیدترافسانہ نگاروں میں اپنی انفرادیت کے باعث نمایاں مقام رکھتا (ہے۔(۳

احمد داؤد نے جب لکھنے کا آغاز کیا تو سب سے پہلے جسے کہانی کا شریک بنایا اور کہانی کی اصلاح لی وہ رشید امجدہیں احمد داؤد سے کچھ عرصہ پہلے کہانیاں لکھ رہے تھے اور :ادبی حلقوں میں اپنا باقاعدہ ایک مقام بنا چکے تھے۔رشید امجد کے مطابق

یہ غالباً۱۹۶۸ءکے آگے پیچھے کا زمانہ ہے ایک شام دروازے پر دستک ہوئے، نیچے اترا تو دو نوجوان دروازے کے دائیں بائیں کھڑے تھے۔۔۔ "

میں نے پوچھا "جی؟

، بولا" آپ رشید امجد ہیں؟"

،کہا" جی"

بولا" کہانیاں لکھتے ہیں؟”

م"میں نے سر ہلایا، بولا

میں احمد داؤد ہوں اور یہ یوسف چوہدری ہیں۔ہم آپ کی کہانیاں پڑھتے ہیں۔آج ہم نے آپ کی ایک کہانی پڑھی ہے۔"اوراق" میں،میں نے پوچھا" آپ بھی لکھتے ہیں؟ (دونوں نےاثبات میں سر ہلایا۔“ (۴

مندرجہ بالا اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ احمد داؤد نے کہانی لکھنے کا آغاز ساٹھ کی دہائی کے آخری چند سالوں ہی میں کر دیا تھا۔مگر زیادہ کہانیاں ستر کی دہائی میں لکھیں۔ خاور نقوی لکھتے ہیں۔

(ان کا (احمد داؤد)پہلا افسانہ "کالا فرشتہ کے نام سے ۱۹۶۸ءمیں روزنامہ ”تعمیر " روالپنڈی کے ادبی صفحے پر شائع ہوا۔(۵"

احمد داؤد کا پہلا افسانوی مجموعہ مفتوح ہوائیں کے نام سے ۱۹۸۰ءمیں منظر عام پر آیا جسے انھوں نے مسعود اللہ خان اور ڈاکٹر خالد سعید بٹ کے نام انتساب کیا۔(۶)کتاب کا سرورق حمید ساغر نے بنایا جبکہ دی پرنٹ لائن ااے پلازا بلیو ایریا اسلام آباد نے اسے شائع کیا۔اس افسانوی مجموعے میں کل چودہ افسانے شامل ہیں جن میں" اوپن ایئر میں خودکشی" ، گزرے لمحوں کا عذاب "، تلاش "بنجر ریکھا کا سفر "اپنے گھر کی کہانی "بے سمت سفر کا آشوب"گرتے آسمان کا قصہ "اندھے سفر کا گواہ " وہسکی اور پرندے

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol. 5 No.1 2021

کا گوشت"عجائب گھر"سیریز کے تین افسانے، کمپوزیشن۔۷۹ "اور گمشدہ مسافروں کی گاڑی " شامل ہیں۔افسانوں سے قبل مجید امجد کی نظم کا ایک اقتباس بھی کتاب میں موجود ہے:

محمد علی صدیقی کا تحریر کردہ مفتوح ہوائیں پر ایک تجزیہ میں وہ لکھتے ہیں

ان کے افسانوں میں ایک عجیب سی سادگی اور سریت ہے حسن اور گہرائی ہے۔ان کے افسانوں کا واحد متکلم بہت اچھا کردار ہے۔۔۔۔۔۔۔وہ دوسروں کے ذریعے زندگی کا مطالعہ کرنے کا خوگر ہے۔سچی بات یہ ہے بڑا چلبلا اور البیلا کردار ہے۔جس کی شریر خود کلامی میں قیامتیں بھری ہوئی ہیں اور کمال یہ ہے کہ قیامتیں چھلکنے نہیں پاتیں۔(۷)

اوپن ائیر میں خودکشی مفتوح ہوائیں کی پہلی کہانی ہے۔یہ کہانی دو ایسے نوجوانوں کے درمیان بنائی گئی ہے جو بزدل ہیں۔حالات کا مقابلہ کرنے کی سکت نہیں رکھتے۔حالات اور معاشرے کے جبر کے خلاف مزاحمتی رویہ اپنانے کی بجائے فرار میں پناہ ڈھونڈتے ہیں۔اس کہانی میں معاشرے کی فرسودہ روایات اور اقدار پر گہرا طنز ملتا ہے۔ایسے معاشرے کی کہانی ہے جہاں لوگ اپنی مرضی سے اپنی زندگیوں کا فیصلہ کرنے کا حق نہیں رکھتے۔جہاں لوگ جھوٹی انا، رقابت اور دشمنی کا شکار ہوتے رہتے ہیں۔

یہ افسانہ موجودہ نسل کے المیے کی داستان میں بزرگ اور نوجوان سب ایک خطرناک گرداب میں پھنسے ہیں۔سب ایک دوسرے کو کسی رنگ میں بلیک میل کرتے ہیں۔کوئی محبت کے نام پر تو کوئی معاشرے کے نام پر۔افسانے کی ہیروئن ایسے لڑکے سے ملنے سے اس لیے انکار کر دیتی ہے جسے اپنی ماں سے محبت ہے۔

"اس نے دھمکی دی ہے کہ خودکشی کر لے گی۔"

افسانے کا ہیرو بھی اس لیے پیش قدمی نہیں کرتا اور کہتا ہے

(میرے باپ کو میری خواہش کا پتہ چل گیا ہے۔وہ ہر وقت تکیے کے نیچے عاق نامہ رکھتا ہے۔"(۸"

وہ دونوں ایک دوسرے کے بغیر رہ بھی نہیں سکتے اور معاشرے کی بے جاروایتوں کی زنجیر توڑنا بھی ان کے لیے مشکل ہے۔وہ خود ساختہ جبر کا شکار ہیں۔وہ دونوں قسطوں میں خودکشی کر رہے ہیں۔چھپ کر ملنے ور نہ ملنے کا رنج دونوں کو گھائل کئے دے رہا ہے۔اس افسانے میں جہیز کی لعنت کی بھی نشان دہی کی گئی ہے۔عورت کی اس سرشاری اور مسرت کو بھی بیان کیا گیا ہے جب اسے احساس ہو کہ کوئی مرد اس کی خاطر جان تک دینے کو تیار ہے۔عورت کی نفسیات کو بھر پور طریقے سے بیان کیا گیا ہے کہ وہ کسی طرح کومل جذبوں اور محبتوں کو پامال ہوتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی۔وہ ماں باپ اور محبوب تینوں سے محبت کرتی ہے۔تینوں کو ایک ساتھ چاہتی ہے۔ان میں تفریق نہیں کر پاتی۔ہر مرتبہ وہ اس سے کبھی نہ ملنے کا کہہ کر واپس آتی ہے اور اگلی بار پھر اس سے کبھی نہ ملنے کا کہہ کر اٹھتی ہے۔دونوں کردار گول دائرے میں گھوم رہے ہیں۔مسائل کا حل نہیں نکال پاتے اور نہ ہی اس چکر سے نکل سکتے ہیں۔

اس نے پھر اسے خط لکھا تھا آؤ مجھے ملو۔۔۔۔۔۔نہیں تو میں خودکشی۔۔۔۔۔"

(اور یہ ان کی آخری ملاقات تھی"۔(۹

کہانی میں کرداروں کے نام نہیں ہیں۔کہانی ایک منظر نامے کی صورت میں ہے۔ہم اوپن ائیر میں کھلی خنک فضا میں تنی دھوپ کی چادر تلے بچھی گھاس پر آمنے سامنے ایک جوڑے کو بیٹھے باتوں میں مشغول دےکھتے ہےں۔ساری کہانی اسی اےک منظر پر محیط ہے۔

دوسرا افسانہ "گزرے لمحوں کا عذاب "ہے۔اپنے نام ہی سے اپنی معنویت کو ظاہر کرتا ہے۔یہ کہانی دو کرداروں کے گرد گھومتی ہے جن کا کوئی نام نہیں۔ایک مرد اور عورت دونوں کے ماضی کے حوالے سے ایک نفسیاتی بیان ہے۔عورت کا کردار طوائف کا ہے جسے مرد چند روپوں کے عوض رات بھر کے لیے خرید لاتا ہے

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol. 5 No.1 2021

مگر لذت کشید کرنے کے جس مقصد کے تحت وہ اسے لاتا ہے اس میں کامیاب نہیں ہو پاتا۔اس کی وجہ عورت نہیں بلکہ اس کا اپنا ماضی ہے جس نے اس کے اندر ڈر خوف اور بوکھلاہٹ بھر دی ہے۔ڈر خوف اس کے گلے میں کڑوی اسفنج نما چیز کی طرح اٹکا رہتا ہے اور وہ زندگی کی لطافتوں سے لطف اندوز نہیں ہو سکتا۔مرد کا کردار عورت کے مقابلے میں کمزور اور بے بس کردار ہے جبکہ طوائف کا کردار مضبوط ہے اور تمام کہانی اس کے گرد گھومتی ہے۔وہ پیشہ ور ہونے کے باوجود ہمدرد دل رکھتی ہے۔مرد کا کردار جب عورت سے شراب پیتے ہوئے پوچھتا ہے کہ۔

یہ تمھارے گرد کالا غلاف کیسا ہے"؟"

(تو وہ جواب دیتی ہے،" یہ غلاف نہیں برقعہ ہے۔آپ زیادہ پی گئے ہیں نا"۔(۱۰

احمد داؤد نے اس کہانی میں ایسے مرد کو دکھایاہے جو بچپن کی بے جا سختیوں کی وجہ سے آج بھی خوف زدہ ہے۔اس کے لاشعور میں والد کی بے جا ڈانٹ اور استاد کی غلط سختی اور جبر ٹھہر گیا۔والد استاد اور معاشرے نے جنس کی جانب سے اس کے فطری میلان کو جس غلط انداز سے روکا اس کا اثر عالم شباب میں بھی اس کی شخصیت پر قائم ہے۔وہ عورت کالمس محسوس کرنے کے لیے جب بھی ہاتھ بڑھاتا ہے اس کے گلے میں اسفنج نما ڈر اسے کھینچ کر ماضی میں لے جاتا ہے جہاں اس کا باپ اور استاد دونوں ہاتھوں میں لٹھ لیے تیار کھڑے ہیں۔یہ دو کردار ایسے ہیں جو ساری زندگی اس کے اعصاب پر سوار ہیں۔مثلاً استاد:

اچھی لگتی ہے۔۔۔حرامی کہیں کا۔۔۔۔کیا وہ تیری ماں ہے؟ یا۔۔۔۔۔خبردار جو اس کا خیال بھی کیا۔۔۔۔کھال ادھیڑدوں گا۔۔۔۔۔کام چور۔۔۔کتاب میں لڑکیوں کی ")تصویریں۔۔۔۔۔کون ہے یہ؟ یہ۔مم۔مم میری استاد چلایا۔۔۔۔دو اینٹیں اور رکھ دو۔"(۱۱

بچپن سے ہی دل میں بیٹھ جانے والا خوف اسے کچھ بھی نہیں کرنے دیتا۔اپنے مہلک ماضی اور اس میں لپٹے خوف سے کسی طرح بھی چھٹکارا حاصل نہیں کر پاتا۔اس کے اندر انتقام ہے جو وہ کبھی تو زیادہ شراب پی کر اور کبھی طوائف کے ننگے بدن کو سگریٹ سے جلا کر خود کو اپنے والد اور استاد اور آج کی ہرچیزسے لیناچاہتاہے۔مصنف نے اس کہانی میں جنس کے فطری میلان کی پیچیدگیوں جسے باریک موضوع کوبہت کامیابی سے نبھایا ہے۔

مجموعے میں شامل تیسرا افسانہ "تلاش" کے نام سے ہے جو اس کتاب کے شائع ہونے سے پہلے ادبی رسالے "اوراق" میں جولائی اگست ۱۹۷۸ءکے شمارے میں چھپ چکا تھا۔احمد داؤد نے اسے مجموعے

میں شامل کرنے کے لیے اس میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔جوں کا توں کتاب میں شامل کر دیاہے۔

تلاش"مارشل لا کے تناظر میں لکھا گیا بھر پور افسانہ ہے جسے بے گناہ لوگوں کو محض شک کی"

بنیاد پر بند کر دیا جاتا ہے۔ان کے بنیادی انسانی حقوق اور اظہار و تقدیر پر پابندی لگا کر انھیں چڑیاگھر میں بند جانور تسلیم کر لیا جاتا ہے جن کی اپنی آزادی اور آواز نہیں ہوتی۔"تلاش"ایسے سچ کی تلاش ہے جسے وہ نوجوان حوالات سے رہا ہونے کے بعد پاتا ہے جو پہلے بے گناہ اور محض شک کی بنا پر درندوں کی اذیت برداشت کرتا ہے۔

مصنف نے یہ بیان کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے کہ چند سچے حروفوں کی طاقت تو پیں اور ٹینک رکھنے والوں کے تمام اسلحے سے زیادہ ہے اور آمر طبقہ لفظوں کی بغاوت سے کسی قدر خوف زدہ ہے۔انھیں احساس ہے کہ قلم کی نوک سے نکلے ہوئے سچے حرف ان کی تباہی اور انقلاب کا باعث بن سکتے ہیں۔اسی لیے وہ قلم کاروں کو ذہنی اور جسمانی دونوں سطحوں پر خرید لیتے ہیں۔محبت اور نفرت کے تمام حربے استعمال کرتے ہیں تاکہ ان کی سوچ اور قلم کو اپنے گھناؤنے ارادوں کے مطابق ڈھال سکیں۔مجموعی طور پر "تلاش"مارشل لا کے دور میں ہونے والے جبر و تشدد اور ظلم برپا کرنے والے لوگوں کی عکاسی پر مبنی ہے۔

چوتھا افسانہ"بنجر ریکھا کاسفر"ہے جو اوراق میں اپریل مئی ۱۹۷۵ءکے شمارے میں شائع ہو چکا تھا۔اس میں احمد داؤد نے اپنا مخصوص علامتی رنگ اختیار کیا ہے۔محض اس بات کو واضح کرنے کے لیے کہانی تخلیق کی ہے کہ جب ہاتھوں کی لکیریں بنجر ہو جاتی ہیں تو ان میں مقدر کی فصلیں نہیں اگتیں۔ایسی قوم جو اپنی ریکھائیں رہن دیتی ہیں وہ زندگی میں کچھ بھی نہیں پا سکتیں۔اس افسانے کے کردار کی کسی ایسی جگہ جانا چاہتے ہیں جہاں وہ اپنی ریکھاؤں کے خود مالک ہوں۔احمد داؤد نے اس

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022

Vol. 5 No.1 2021

افسانے میں خوبصورت لفظ چن چن کر استعمال کیے ہیں۔پورا افسانہ لفظی بازی گری دکھائی دیتا ہے۔یوں لگتا ہے جیسے ضروری لفظوں کو محض اسلوب کی تزئین و آرائش کے لیے رنگ برنگی لڑیوں میں پرویا گیا ہے۔"اوپر آسمان کے ماتھے پر بیٹھی رات۔۔۔۔ستاروں کو پوشاک اوڑھے مجھے گھور رہی تھی سیٹی کی باریک لہر چاندنی کو دودھیا ناؤ میں تیرتی دیواروں کو اپنی نازک پوروں سے مس کرتی سامنے نظر آتی کھڑکی پر جا بیٹھی۔تب میں نے دوسری سیٹی بجائی کہ پہلی کو تقویت ملے۔"(۱۲)کہانی دور کہیں غائب ہو جاتی ہےاور قاری لفظوں کے گورکھ دھندے میں الجھ کر رہ جا تا ہے۔

افسانہ" گرتے آسمان کا قصہ" جس میں احمد داؤد نے روایت کے قدیم اور بہت باریک موضوع کو چھیڑا ہے کہ مرنے کے بعد مردوں کی روحیں گھروں میں آتی ہیں اور توہمات پرست لوگ ان کے لیے دیے بھی جلاتے ہیں اور گھروں میں آنے والی ان روحوں کو نیک روحیں کہا جاتا ہے خواہ زندگی میں ان مرنے والوں نے کتنے ہی گناہوں کے جال نہ بنے ہوں اور ان روحوں کے آنے کو نیک شگون سمجھا جاتا ہے۔خاص طور پر خواتین اس طرح کے توہمات کا زیادہ شکار ہوتی ہیں اور روز مرہ کے چھوٹے چھوٹے عام کاموں میں بھی کسی نہ کسی صورت روحوں کا تذکرہ اور موجودگی کے احساس کو پیدا کر دیتی ہیں۔

اس کے علاوہ احمد داؤد اس کہانی میں ایک اور موضوع کو بھی ساتھ ساتھ لیے چلتے ہیں کہ ہم سب نے اپنے اندر اپنا ایک بت چھپا رکھا ہے جسے ہم دوسروں سے پوشیدہ رکھنا چاہتے ہیں۔اس کی ایک وجہ ہمارا احساس کمتری ہے اور یوں بھی شخصیت کے بت کا ہر پہلودوسروں پر کبھی عیاں نہیں ہوتا بلکہ بعض اوقات ہم خود اس بت کی بہت سی باتوں سے بے خبر رہتے ہیں۔ہم اکثر رات کو اس بت سے باتیں کرتے ہیں۔اس بے دھڑ بت کو مکمل کرنا چاہتے ہیں ان تو ہمات پرستوں اور غلط روایات سے نکلنا چاہتے ہیں مگر ایسا کر نہیں سکتے۔ڈرتے رہتے ہیں۔خود سے معاشرے کی روایات سے بغاوت کا حوصلہ ہمارے اندر پیدا نہیں ہو سکتا۔

"بھیا آپ کو ڈر نہیں لگتا ؟"

"کس چیز سے؟"

"کسی بھی چیز سے۔۔۔موت سے۔۔۔۔اندھیرا اور بتوں سے؟”

کبھی کبھی لگتا ہے۔مگر اپنے آپ سے۔۔۔۔اپنے نامکمل پن سے۔ "

اور میں سوچنے لگتا ہوں کہ ہم ابھی تک وہیں ہیں جہاں سے چلے تھے۔

(بہت بت سامنے ہوتے تھے۔ٹھوس بت۔اب اندر چھپ گئے ہیں۔(۱۳)

پہلے بت سامنے ہوتے تھے اب اندر چھپ گئے ہیں"یہ جملہ اپنے اندر گہری معنویت لیے ہوئے ہے۔اس افسانے کے تمام کردارفضا اور ماحول کے تجریدی سایوں میں رہنے والے کے باوجود حقیقت کے سچے نمائندے ہیں۔

عام زندگی میں احمد داؤد روایت اور فرسودہ قسم کے غیر اسلامی طریقہ عقیدت کو ناپسند کرتا تھا۔اس کہانی میں بھی وہی لہجہ اور تاثر در آیا ہے۔لاعلمی ایک بہت بڑی نعمت ہے۔آگہی کا شعور انسان کو بہت دکھ دیتا ہے۔اس کے دن اور رات تفکرات سے بھر دیتا ہے۔

اندھے سفر کے گواہ"ایک منظرنامہ ہے۔مصنف ایک تصویر دیکھتا ہے اور اس کو ماضی کی وہ تمام باتیں یاد آجاتی ہیں جب اس نے بھاگے ہوئے ایک شخص کو اپنے گھر " میں پناہ دی تھی اس پناہ گیر نے بتایاتھا کہ"وہ لوگ"اس کی بہن کو اٹھا کر لے جا رہے تھے تو اس نے محض اتنا کہا تھاکہ مجھے اس کے بدلے میں کچھ چاول ہی دے دو جس پر وہ لوگ اس کی جان کے دشمن ہو گئے تھے۔کہانی کے بیان میں بے باکی اور جملوں کی بے ساختگی خاصے کی چیز ہے۔حاکم وقت اور موجودہ نظام کی تباہ کاریوں کے خلاف اتنا کھلا انداز احمد داؤد کے اسلوب کا اہم حصہ ہے جو اس کہانی میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔مصنف کو کہانی کے دوران تصویر دیکھتے ہوئے وہ دن بھی یاد آتے ہیں۔ جب چہار سوامن کی فاختہ گیت گایاکرتی تھی۔گھر کے سامنے دھان کا کھیت اور تالاب میں مچھلیاں تیرتی رہتی تھیں۔بیوی کا مسکراتا روپ اور بیتے دنوں کی یاد اس کے لہو

میں آگ بھر دیتی ہے۔ذو معنی جملوں کی کمال بنت اس کہانی میں نظر آتی ہے۔بیوی کے منہ سے مصنف حقیقی اور بھر پور جملے کہلواتا ہے۔وہ یہ جانتا ہے کہ فیصلے ہمارے ارادوں کے محتاج ہوا کرتے ہیں۔

"مگر فیصلہ تو ہمارے ارادوں کا محتاج ہوتا ہے اس کی بیوی نے ایک بار کہا تھا۔"

لیکن ہمارے ارادوں پر دوسروں کا اختیار ہے "وہ بولا"

"لیکن یہاں سے نکلنا بھی تو ضروری ہے"

(نکلنا تو ضروری ہے ، مگر کیسے؟"ہمارے گلوں میں بندھی رسی دوسروں کے ہاتھ میں ہے۔وہ سوچ میں پڑ گیا کہ فیصلوں کا مالک کیسے بنا جائے۔"(۱۴"

ادب جو معاشرے میں موجود مایوسی کی اندھیری فضا میں جدوجہد اور آس کا کوئی ٹمٹاتا جگنو چھوڑتا ہے یا امید کی کوئی ایک کرن جگمگاتا ہے اور اسی روشنی میں زندگی مقصدیت کی طرف ایک قدم بڑھا دیتی ہے۔یہی روشنی اور امن کی شاہراہوں پر گامزن کر دینے والا ادب ہی دراصل مزاحمتی ادب کہلاتا ہے۔احمد داؤد نے فرد کی بنیادی ضرورت اور روحانی آزادی کے ساتھ ساتھ ان کی عزت و تکریم کی پامالی کے خلاف احتجاج کیا۔اس کے لیے اسے بار بار روحانی و جسمانی کرب سے بھی گزرنا پڑا اس نے جبر و ظلم کو نہ صرف خود محسوس کیا بلکہ کہانیوں کے ذریعے دوسروں تک بھی اس دکھ کرب اور اذیت کے احساس کو منتقل کیا۔

وہسکی اور پرندے کا گوشت " اس عہد کی پیداوار ہے جب وقت کی شہ رگ پر بھاری بوٹوں والا پیر رکھ دیا گیا تھا جس سے وقت کی سانس رکنے لگی تھی اور " معاشرے میں بے چینی ، گھٹن اور افرا تفری پھیل گئی تھی۔مصنف ایک اونچی منزل پر کھڑا ہاتھ میں دوربین لیے شہر کا نظارا کر رہا ہے اور تمام تر افسانہ اسی دوربین ہی کی آنکھ سے ترتیب پاتا ہے۔اس سے وہ اتھل پتھل شہر کے تمام مناظر دیکھتا ہے۔اسے شہر ویران لگتا ہے۔روشنیاں پھٹی اور بے جان لگتی ہیں۔آسمان پر اڑتے نیلی خلا کے طشت پر تیرتے پرندوں کو دیکھتا ہے تو اس کے اندر بھی آزادی کی خواہش جنم لیتی ہے اور پھر جب وہ معصوم پرندوں کو سپاہیوں کی بندوق کا نوالہ بنتے ہوئے خون میں پتوں کی مانند سڑک پر گرتے ہوئے دیکھتا ہے تو اس کے ذہن میں سوال ابھرتا ہے۔

کیا آسمان تلے ان پرندوں کو آزادی میسر ہے؟"

اگر میرے پر ہوتے تو یقیناً اچھا نہ ہوتا۔" (۱۵)

:اس کہانی کا واحد متکلم کردار زندگی کے المیوں کے محرکات کے بارے میں سوچنے کا شعور رکھتا ہے۔اسے احساس ہے کہ

(آدمی کے ہونے کا جواز سوچنے میں ہے اور جب وہ اپنے ہونے کی شہادت دوسرے کو دیتا ہے تو مکروہ ضابطوں کا خوف اسے بے بس بنا دیتا ہے۔"(۱۶"

یہ ایک اسے دور کی کتھاہے جب انسان کو اپنے حقیرپن ، اپنی کم مائیگی کا احساس ہو چکا تھا۔وہ اس ذلت

کی زندگی سے مر کر ہی فرار حاصل کر سکتا تھا۔مرنے کی خواہش اس کے اندر بار بار کروٹ لیتی تھی مگر موت پر بھی اس کا اختیار نہیں تھا۔اس افسانے میں واحد متکلم کردارر اپنی ذات کی تلاش میں ہے۔ایمان کی تلاش میں ہے امن اور آشتی کی نوید سنانے والوں کو منتظر ہے۔"وہ نصف ایمان"اور نام نہاد قومی سلامتی کے نظام سے نفرت :کرتا ہے۔وہ پورے ایمان کی تلاش میں ہے۔وہ پورے جذبوں اور پوری آزادی کے ساتھ جینے کا تمنائی ہے۔اسی لیے وہ بار بار کہہ اٹھتا ہے

"نصف ایمان کے ساتھ جینا عذاب ہے"

"نصف ایمان کے ساتھ جینا ذلت ہے۔"

(نصف ایمان کے ساتھ جینا گناہ ہے۔"(۱۷"

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol. 5 No.1 2021

وہسکی اور پرندے کا گوشت "موضوع، اسلوب اور تکنیک کے اعتبار سے بھر پور افسانہ ہے۔موضوع کے برتاؤ کے حوالے سے ہم اسے دیانتداری سے تخلیق کیا ہوا " افسانہ کہہ سکتے ہیں۔اس افسانے میں ہمیں کسی قسم کی منافقانہ مفاہمت یا سماجیاتی و سیاسی دغا بازی نظر نہیں آتی۔

احمد داؤ د نے لمحہ موجود کے سیاسی اور سماجی سفاک رویوں کی جس طرح اور جس شکل میں محسوس کیا ہے بالکل اسی طرح بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ ہی بے دردی سے اظہار کیا۔تحریری طمانچہ معاشرے اور اربابِ اختیار کے گھناؤ نے چہرے پر نقش کر دیا ہے۔افسانے میں احمد داؤ د کی بے باکی، جرآت اور خوفناک حد تک زہر اگلتی سچائی کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔اس افسانے کو "مفتوح ہوائیں" کا بہترین اور بھر پور افسانہ کہا جا سکتا ہے جس کے ایک ایک لفظ میں صداقت اور شجاعت کا سمندر موجزن ہے اور احمد داؤ د کو بڑا افسانہ نگار بنانے میں اہم قدم بھی۔

عجائب گھر" جولائی اگست ۱۹۷۸ءمیں "اوراق"کے شمارے میں شائع ہوا اور اس نے افسانے کے قارئین کو چونکا دیا۔"مفتوح ہوائیں"میں عجائب گھر۔۲اور " عجائب گھر۔۳بھی شامل ہیں۔اس طرح عجائب گھروں کی مثلث بنتی ہے جس میں احمد داؤ د نے ہمیں تین منظر دکھائے ہیں۔اگر احمد داؤ د کا کوئی اور افسانہ بھی پڑھا جائے تو اس کا افسانوی نصب العین واضح کرنے کے لیے یہ تکون ہی کافی ہے۔انھیں تین بہترین منظر نامے کہا جا سکتا ہے۔ان کو پڑھتے ہوئے قاری کے ذہن میں آرٹ فلم کاکیمرہ ان ارضی صداقتوں سے بھر پور مناظر کو جمالیاتی تحرک کے ساتھ نہ صرف دکھا تا چلا جا تا ہے بلکہ ان مناظر کے ہونے کو تسلیم بھی کراتا ہے۔

ان تینوں افسانوں کے مناظر میں گھٹن ، فرسٹریشن ، عمرانی و سیاسی الجھن کا احساس شدید ہو جاتا ہے۔مگر انسانی شعوریت کا احساس افسانوی کےنوس کو وسیع تر بنا دیتا ہے۔بصری امیجز کی شان علامت کو شفاف اور قابل تفہیم بنا دیتی ہے۔ان افسانوں میں احمد داؤ د نے آرٹ فلم کی تکنیک اور امیجز کو استعمال کیا ہے۔افسانہ پڑھتے ہوئے پڑھنے کا احساس کم اور دیکھنے کا گمان زیادہ ہوتا ہے۔افسانوں کے تمام مناظر مخصوص عہد کے اہم منظر نامے ہیں احمد داؤ د نے اپنے عمیق مشاہدے کی بنا پر ایسا جیتا جاگتا لینڈ سکیپ تیار کیا ہے جس میں لوگ ہنستے ، بولتے ،لڑتے ، جھگڑتے ، دکھوں اور اذیتوں کے شکار دیکھے جا سکتے ہیں۔منظر نامے کو واضح طور پر دکھانے کے لیے امیجز کا تشریحی پھیلاؤ بہت زیادہ ہے مگر اسے غیر ضروری نہیں کہا جا سکتا۔

میں نے بات ادھوری چھوڑی اور شیشے سے باہر دینا کے چہرے پر جمی دھول پر نظر جمادی۔سڑک کے مشرقی جانب سے ایک جلوس نمودار ہوا۔کوڑھیوں اور بھکاریوں کا " جلوس۔ان کی ریڑھیوں سے بندھی ٹوکریوں میں لا چار بچے اپنے ہاتھ پاؤں کے انگھوٹے منہ میں ڈالے اپنی رطوبت چوس رہے تھے۔ٹریفک سگنل کے پاس پہنچ کر وہ رک (گئے کہ سرخ بتی جل رہی تھی۔"(۱۸

عجائب گھر سیریز کے تینوں افسانوں میں بندھے ٹکے معاشرتی ڈھانچے سے بغاوت اور اس ڈھانچے کو تحفظ دینے والے کرداروں سے نفرت کا رویہ ملتا ہے۔احمد داؤ د نے ان افسانوں میں اپنے لہجے کی ازلی بے باکی، نفرت اور بھر پور بغاوت کے ساتھ اس پورے عہد کی منظر کشی کی ہے۔تینوں منظر ناموں میں سماجی خوف اور سیاسی مصلحت کا گزر نہیں ہوتا۔احمد جاوید کہتے ہیں :"عجائب گھر سیریز " اور "وہسکی اور پرندے کا گوشت" خاص طور پر قابل مطالعہ ہیں۔میں ان میں اپنے عہد اور اپنی نسل کے سارے الم (یکجا دیکھتا ہوں۔(۱۹

کمپوزیشن ۷۹ء "میں بھی اس عہد کی ترجمانی ہے جس کی پھیلائی ہوئی تباہ کاریوں کی زد میں ہم آج بھی ہیں۔جس عہد کے نفرت ، عداوت اور منافقت کے " بوئے ہوئے بیجوں کی فصل ہم آج بھی فرقہ ورانہ تعصب اور دہشت گردی کی صورت میں کاٹ رہے ہیں۔احمد داؤ د کی اس عہد کے ساتھ خاص کمٹمنٹ تھی۔یہی وجہ ہے کہ اسے لمحہ موجود کسی صورت قبول نہیں کیونکہ سمجھوتہ کر لینے والوں میں سے وہ نہیں تھا۔

زمانی صداقتیں قیام پاکستان کے بعد جس اتھل پتھل کا شکار رہیں انھوں نے ہر حساس فرد کی طرح احمد داؤ د میں ذات کی تلاش اور اپنی شناخت کا مسئلہ پیدا کیا۔اس کہانی کے منظر نامے میں تہذیبی اور معاشرتی خلفشار اور اضطراب کا ایک عالم آباد ہے۔

ابھی پچھلے دنوں پولیس نے سڑک پر مباشرت کرنے والوں کو پکڑا تھا۔وہ سڑک کے کنارے بستر لگا کر پرندے پکڑ رہے تھے کہ پولیس نے انھیں پکڑ لیا۔لڑکیوں کو " لاک اپ میں بند کیا اورلڑکوں کو اپنی مسہریوں پراوندھا لٹا دیااور گواہ تلاش کیے۔گواہ جانتے تھے کہ پیغمبر کے نزدیک سب سے بڑی شہادت زنا کی شہادت ہے اور چونکہ

گواہ نے بھی اپنی باری آنے پر فٹ پاتھ کے کنارے وہی فعل سرانجام دینا تھا جس کے خلاف اسے گواہی دینی تھی۔سو سارے شہادتی بھاگ گئے۔تب جوڑوں نے ایک دوسروں کے خلاف گواہی دی اور سرکاری گواہ نے ان کے خلاف۔"(۲۰)

افسانے کا انداز آرٹ فلم یا پھر ڈرامے کا سا ہے۔حقیقت کی مسخ شدگی کے خلاف احتجاج کی فضااس افسانے کا انداز بیاں ایسے بچے کا سا ہے جو حیرت کے ساتھ ہر خیال ہر جذبے اور ہرپکار کو زندہ دیکھنے کا آرزو مند ہے۔احمد داؤد کا زندگی اور سماج کے بارے میں مشاہدہ بہت سفاک اور تلخ نگاہی کا ہے۔وہ افسانوں میں دنیا کے سٹیج پر ہونے والے کھیل دکھاتا ہے۔اسے لگتا ہے کہ ہم دنیا کے سٹیج پر مجبور کرداروں کی طرح چھوڑ دیے گئے ہیں جن کے بس میں کچھ بھی نہیں ہے۔اس سٹیج کھیل کی ہدایت کوئی اور دیتا ہے۔ہم مجبور محض ہیں۔عمل کرنے کے پابند ہیں۔فتح محمد ملک کے نزدیک:

بے شک "کمپوزیشن ۷۹" میں موسیٰ و فرعون کی قرآنی آیات کے ساتھ ساتھ حق بات کی پاداش میں دارورسن کی آواز پر لبیک کہنے والوں یا پھر باطل کے ساتھ صلح کرنے کی بجائے ترک دنیاکر جانے والوں کی یادوں نے ماحول کہ تہ درتہ ظلمت میں نورکاایک جال سا بن رکھا ہے۔" (۲۱)

مفتوح ہوائیں کی کہانیاں ہمیں معاشرے کی بے چہرگی کا چہرہ دکھاتی ہیں۔اس کے تمام کردار ہمارے لیے آئینہ ہیں۔اس آئینے میں ہم اپنی اور پراگندہ معاشرت کی جھلک دیکھتے ہیں اور یہ جھلک صداقت کی آئینہ دار ہے کیونکہ آئینہ ہمیں وہی صورت دکھاتا ہے جو اصل اور سچی ہے۔فنکار معاشرے کا حساس ترین فرد ہونے کے ناطے اپنے ارد گرد ہونے والے واقعات پر عام آدمی کی نسبت گہری نظر رکھتا ہے۔اپنے ساتھ زندگی گزارنے والوں کے دکھ اور مسائل اس کے قلم سے لہو بن کر ٹپکتے ہیں۔اس کا فن اس کے عہد کی زندہ تصویر ہوتا ہے۔

جرمن فلسفی کانٹ کہتا ہے ، میرے ہونے کی دلیل ہے کہ میں جو کچھ بھی کر سکتا ہوں وہ مجھے ضرور کرنا چاہیے،میرے ارادے کی آزادی سے خدا کے وجود کا سراغ ملتا ہے جب کہ خدا کے وجود نے دنیا میں باطل قوتوں کے ایک دن مٹ جانے کا استنباط ہوتا ہے۔کتاب مقدس میں آیا ہے۔ہر شے ہلاک ہو جائے گی سوائے اس کے چہرے(ذات) کے۔وادی فاران کے محترم نبی ﷺ نے فرمایا ایمان کی سب سے کمزور حالت ظلم کے خلاف دل میں نفرت کے جذبات کو جگہ دینا ہے مراد یہ کہ اگر کوئی شر کے خلاف برسرپیکار نہیں ہو سکتا تو کم از کم اسے ناگواری اور نفرت کا اظہار تو ضرور کرنا چاہیے دنیا میں ادیب کی ذمہ داری یہی ہے کہ حسن اور خیر کی تحسین و تجلیل کرے اور بدصورتی اور شر کی تردید کرے۔احمد داؤد نے اس فریضے کو اپنے افسانوں میں بطریق انجام دیا ہے۔اس کی کہانیوں میں ظلم اور بدشکلی کی ہر صورت کے خلاف صدائے احتجاج کی گونج سنائی دیتی ہے۔اس نے اظہار نفرت (تبرہ) کی قدیم روایت کو ایک نئے انداز سے برتا ہے۔پوری ایمانداری کے ساتھ۔

احمد داؤد کی تمام کہانیاں میں ان دنوں کی داستان ہے جب بولنے کی سزا تختہ دار تھی اور جب ہاتھوں کی ریکھائیں بنجر ہو چکی تھیں۔ان میں آرزوؤ ں کی فصل نہیں اگتی تھی جب پرندوں نے گھونسلوں سے نکلنا بند کر دیا تھا اور حبس آلود سانسوں سے جسم کی فصیل دھیرے دھیرے ڈھ رہی تھی جبر و تشدد کے بعد معاشرے میں رد عمل کے طور ر جنم لینے والی قباحتوں کا بھرپور تجزیہ ہے۔

ڈاکٹر اقبال آفاقی کے نزدیک:

احمد داؤد کے افسانے تاریخ کے ایک مخصوص دورانیے میں نہایت خوف ناک ذہنی حقائق سے دو چار کرداروں کے افسانے ہیں ، جن کی تقدیر میں بے ثمر " موسموں کا عذاب جھیلنا تھا۔غربت، بیماری، جنسی بھوک اور حبس کے مارے ہوئے لوگ۔ان کرداروں کو اگر وہ خزاں زدہ رنگوں سے پینٹ کردہ دھندلائی ہوئی منجمند تصویروں کی صورت پیش کر دیتا تو وہ نہ صرف خود اپنی ذات سے زیادتی کا مرتکب ہوتا بلکہ تاریخ اور تہذیب کا مجرم دار بھی ہوتا۔چناچہ ہم دیکھتے ہیں کہ وہ تصویر یں بناتے وقت خاصے بھڑکیلے اور پر شوخ رنگوں کا انتخاب کرتا ہے۔جیسے شہیدوں کے لہو کا رنگ۔اس کے کردار خاصے طرح دار اور بلند آواز نظر آتے ہیں۔"(۲۲)

احمد داؤد نے اس مجموعے میں ہماری زندگی اور ہمارے ارد گرد کے ماحول کو بیان کیا ہے وہ کوئی سکہ بند انقلابی دانشور نہیں لگتا بلکہ اس نے ایک مخصوص آدرشی صورت حال سے انحراف کیا ہے کیونکہ انحراف انسان کا بنیادی مزاج ہے اور اسرار و انکشاف کا عمل انحراف کی صورت ہی ظہور پذیر ہوتا ہے۔اس کے یہاں کردار معاشرتی صداقتوں کے بغیر خود کو نامکمل تصور کرتا ہے۔اورمعاشرے کی میکانی قدروں ، رسم و رواج کی انحطاط کی صورت سے منحرف ہو کر اپنے وجود کا جواز تلاش کرتا ہے اور مردہ افکار کو اپنی لغت سے خارج کرتا ہے۔

احمد داؤد کے اس مجموعے میں کہانی اپنے مکمل علامتی نظام کے ساتھ ہے۔اس میں کبھی کبھی کہانی پن کی عدم موجودگی کا بھی احساس ہوتا ہے۔مگر افسانوں کا افسانوی اظہار بھرپور ہر ہر سطر بذاتِ خود ایک افسانہ ہے جس میں معاشرے کی اکھڑتی ہوئی سانسوں پر غور و فکر کا اچھوتا اسلوب ایک نئے تصور حیات کی دلیل ہے۔ زندگی پر سے اٹھتا ہوا اعتبار ، شکوک اور کھوکھلی اخلاقیات ، اقدار کا بے جا ڈھونگ ، مصنوعی طرز معاشرت اور منافقانہ سماجی رویوں کے خلاف احتجاج کی صورت ہمیں احمد داؤد کے ہاں ملتی ہے۔اس کے ہاں موضوعاتی صداقتوں کے ساتھ ساتھ اسلوب کا اچھوتا پن بھی نمایاں ہے۔مجموعے میں جملے مختصراور بامعنی ہیں۔کہانیوں میں کہیں کہیں مصنف کی جھلک نظر آجاتی ہے جو غیر واضح اور مبہم ہوتی ہے۔

احمد داؤد کا یہ افسانوی مجموعہ ایسے لوگوں کی داستان ہے جو اپنے ہی گھر میں اجنبیت محسوس کرتے ہیں بیرونی دنیا کے تشدد اور حبس کے باعث وہ اپنی شناخت کھو بیٹھے ہیں۔ان لوگوں کے ہاں مردہ دلی ہوتے ہوئے بھی ایک طوفان امنڈتا محسوس ہوتا ہے۔اس طوفان میں آزادی کی خواہش ہے۔اس نظام کو بدل دینے کی آرزو ہے۔یہ افسانے حبس آلود فضا کے خلاف علم بغاوت ہے اور امن وآشتی کے لیے نور کے مینار ہیں۔

حوالہ جات

محمد منشایاد، "مختصر افسانے کے موضوع پر منشایاد سے مکالمہ" ، مشمولہ ماہ نو(لاہور: مئی۱۹۹۱ء) ،ص ۴۵ ۱۔

محمد منشایاد، خواب فروش کی تقریب رونمائی کے موقع پر پڑھے ہوئے مضمون سے اقتباس۔ ۲۔

شہزاد منظر ، مفتوح ہوائیں بروشر،(راولپنڈی: دستاویز پبلیشر ز، س۔ن۔)، ص۶ ۳۔

(رشید امجد، "کہانی سے روٹھا ہوا کردار۔۔۔احمد داؤد"۔(راولپنڈی :جنگ ۱۹دسمبر۱۹۸۶ء ۴۔

خاور نقوی ،"احمد داؤد لاکا ادراک"، ادبیات ،سہ ماہی جلد۸، (اسلام آباد :اکادمی ادبیات ، ۱۹۹۵ء)،ص۹۴ ۵۔

کا ڈائریکٹر جنرل تھا اور مسعود اللہ خاں صحافی ہیں۔لاہور میں ڈان اور فرنٹ پوسٹ سے منسلک تھے۔ PNCA خالد سعید بٹ ان دنوں ۶۔

ڈاکٹر اقبال آفاقی، "احمد داؤد کے افسانے۔۔۔ایک تقابلی تجزیہ" (اسلام آباد :اخبار اردو مقتدر ہ قومی زبان، ستمبر ۲۰۰۸ء)ص ۲۶ ۷۔

احمد داؤد، مفتوح ہوائیں(اسلام آباد: دی پرنٹ لائن بلوایریا ،۱۹۸۰ء) ص۱۱ ۸۔

۱۶ ایضاً ص ۹۔

۲۱ ایضاً ص ۱۰۔

۳۵ ایضاً ص ۱۱۔

۴۰ ایضاً ص ۱۲۔

۷۷ ایضاً ص ۱۳۔

۸۵ ایضاً ص ۱۴۔

۹۴ ایضاً ص ۱۵۔

۹۶ ایضاً ص ۱۶۔

ایضاً ص۹۹ ۱۷۔

۱۰۸ ایضاً ص ۱۸۔

ص ۹ احمد جاوید ، مفتوح ہوائیں ،بروشر۔ ۱۹۔

ص۱۴۴ احمد داؤد ، مفتوح ہوائیں ۲۰۔

فتح محمد ملک،پورے ایمان کی تلاش،دشمن دارآدمی میں پس نوشت کے طورپر مضمون شامل ہے۔ ۲۱۔

ص۶۳ ڈاکٹر اقبال آفاقی ، ”احمد داؤد کے افسانے۔۔۔ایک تقابلی تجزیہ“ ۲۲۔